محمد حنیف ندوی

غزالی کی مشہور کتاب
المنقذ من الضلال
کی تلخیص

غزالی کی سرگزشتِ انقلاب

(۴)

مذہب تعلیم اور اس کی فتنہ سامانیاں

تعلیمیہ ایک فرقہ کا نام ہے اسے باطنیہ مزدکیہ اور قرامطہ بھی کہتے ہیں - جناب اسمٰعیل بن جعفر الصادق کی طرف منسوب ہے - واضح نصوص اور مسلمہ عقائد و افکار کی سمتوں کو سب سے پہلے انھوں نے ہی بدلنے کی کوشش کی ان کا اصول تھا کہ کسی ظاہر کو بھی اس کے اصلی معنی پر محمول نہیں کرنا چاہیئے - کیونکہ ہر ظاہر کا ایک باطن ہے - اور ہر حکم تاویل کا مقتضی ہے - اوّل اوّل اس کی حیثیت ایک مذہبی انداز کے فرقے کی رہی - پھر اس پر سیاسی رنگ چھایا - اور اس کے ماننے والوں نے امام معصوم کے نام سے ایک نئی خفیہ سیاسی تنظیم کی طرح ڈالی - نظام الملک یہ جانتا تھا - کہ اگر ان کے عقائد کو فروغ پانے کے مواقع ملے، تو اس سے اہل السنّت کے سیاسی اقتدار کی بنیادیں ہل جائینگی - اس خطرہ کے پیشِ نظر اس نے غزالی کو ان کی موثر تردید پر آمادہ کیا - یہ تجویز اتنی معقول اور برمحل تھی، کہ غزالی اس کے لئے تیار ہو گئے، اور اپنی تصنیفات میں جابجا ان کے مزخرفات باطلہ کی تفصیل سے تردید کرنا شروع کی - نظام الملک کی اس خواہش کا ذکر انہوں نے اس مضمون میں کیا ہے - اور بتایا کہ اگرچہ اس خواہش کا اظہار حکومت کی طرف سے ہوا تاہم اس میں ان کی اپنی خواہش کی ترجمانی بھی تھی -

عقل کی واماندگی: میں جب علوم فلسفہ پر غور و خوض کر چکا اور ان میں جو مغالطے پنہاں ہیں ان کی تردید سے فرصت پا چکا - تو مجھے محسوس ہوا کہ میرے نصب العین کے لحاظ سے یہ کافی نہیں اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاں تک عقل کی رسائیوں کا تعلق ہے، اس کی واماندگی کا یہ حال ہے کہ تمام مطالب کا یہ احاطہ نہیں کر سکتی اور نہ اس میں اتنی صلاحیت ہے کہ تمام پیچیدگیوں کو دور کر سکے - انہی زمانے میں تعلیمیہ کے ارباب فہم کا چرچا ہوا - اور ان کے ذریعہ یہ بات مشہور ہوئی کہ امام معصوم کے طفیل حقائق امور پر مطلع ہونا ممکن ہے کیونکہ یہ امام معصوم ایسی ذات ہے کہ جس کا براہِ راست حضرت حق سے تعلق ہے - میرے دل میں اس شوق نے کروٹ لی کہ ان کے مذہب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیئے - اور ان کی کتابیں پڑھنا چاہئیں - حسنِ اتفاق ملاحظہ ہو کہ دار الخلافہ سے میرے نام اس مضمون کا حکمنامہ پہنچا کہ میں ان کے معتقدات پر ایک کتاب لکھوں - جس میں کہ ان کے مذہب کی پردہ کشائی کی گئی ہو - یہ حکم ایسا تھا کہ بجز ماننے کے چارہ نہ تھا کیونکہ دل میں پہلے سے اس طرح کا داعیہ ابھر چکا تھا یہ خارجی ترغیب گویا اس دبی خواہش کا ضمیمہ ثابت ہوئی -

اب میں نے ان کی کتابوں اور مقالوں کو جمع کرنے کی کوشش کی۔ اور ان عجیب و غریب اور بالکل اچھوتے کلمات پر بھی نظر ڈالی جو ان کے بزرگانِ سلف سے منقول نہ تھے، بلکہ صرف ہمارے زمانے کے اہلِ علم کے طبع زاد تھے۔ میں نے ان کو ایک خاص ترتیب اور سلیقہ سے پیش کیا اور پھر ان کی پوری پوری تردید کی۔

امام احمد بن حنبل کا ایک اعتراض اور اس کا جواب

بعض اہلِ حق نے جب میری اس محنت و کاوش کو دیکھا تو معترض ہوئے۔ کہنے لگے کہ تم نے ان کے شبہات و دلائل کو اس طرح سجایا ہے کہ خود باطنیہ بھی چاہتے تو ایسا نہ کر پاتے۔ ان کا یہ اعتراض ایک لحاظ سے بجا تھا۔ کیونکہ جب حارث محاسبی معتزلہ کی تردید میں ایک کتاب تصنیف فرما رہے تھے تو امام احمد بن حنبلؒ نے ان پر اسی قسم کا اعتراض کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ درست ہے کہ بدعات کی تردید ہونا چاہیئے۔ لیکن اگر تمہارا انداز جواب میں یہ ہے کہ پہلے تم ان کے شبہات و دلائل کھول کر بیان کرو، پھر ان کی اپنے رنگ میں تردید کرو۔ تو اس میں دو طرح کے احتمال ہیں۔ ایک یہ ہے کہ پڑھنے والا ان شبہات سے نسبتہً زیادہ متاثر ہو۔ اور تمہاری تردید پر نظر ہی نہ ڈالے، یا اگر نظر ڈالے تو اس کو سمجھ نہ پائے اور شبہات اس کے دل میں جم جائیں

امام احمد بن حنبلؒ کا یہ اعتراض درست ہے، مگر صرف ان شبہات کے بارہ میں جو مشتہر نہیں ہیں لیکن جب ایک شبہ پھیل جائے اور شہرت حاصل کرلے تو اس کا جواب دینا ضروری ہو جاتا ہے۔ اور جواب سے اس وقت تک عہدہ برا ہونا ممکن ہی نہیں جب تک کہ ان کے شبہات کو جوں کا توں نقل نہ کیا جائے۔ ہاں اسقدر احتیاط البتہ ہونا چاہیئے، کہ ان کے شبہات کو سجا کر بیان نہ کیا جائے اور نہ بتکلف شبہات پیدا کرنے کی کوشش ہی کی جائے چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا ہے۔ میں نے ان کے شبہات کی جو تفصیل ذکر کی ہے۔ اس کی وجہ میرے ایک دوست کا ان شبہات کو بیان کرنا ہے۔ جو پہلے فرقہ تعلیمیہ میں رہ چکا ہے۔ پھر یہ میرے ساتھ وابستہ ہو گیا۔ یہ ان کے شبہات و اعتراضات کو اکثر مجھ تک من و عن پہنچاتا۔ اور کہتا کہ بعض جوابات کا تو یہ مضحکہ اڑاتے تھے اور کہتے تھے کہ انھوں نے ہماری دلیل پر غور ہی نہیں کیا۔ اس وقت سے میں نے یہ التزام کرلیا ہے، کہ پہلے ان کے اعتراضات نقل کرتا ہوں اور پھر اس کا جواب دیتا ہوں تاکہ میرے متعلق بھی یہ نہ کہا جائے کہ میں ان کے اعتراض کو سمجھا نہیں۔ غرض یہ ہے کہ میں نے کوشش کی ہے کہ مقدور بھر ان کے شبہ کی اہمیت کو واضح کروں اور پھر اچھی طرح اس کے بگاڑ اور فساد کی نشاندہی کروں۔

مخالف کی بھی صحیح بات مان لینا چاہیئے بلاشبہ دُنیا کو ایک امام معصوم کی ضرورت و احتیاج ہے مگر وہ امام معصوم خود آنحضرتؐ کی ذاتِ گرامی ہے۔

میری تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ اگر نادان دوستوں کی احمقانہ نصرتِ دین آڑے نہ آتی، تو ان کا مذہب ایسا لاطائل اور بے معنی تھا، کہ اس کو قطعاً یہ فروغ حاصل نہ ہوتا۔ ان کی بیجا ضد و تعصب نے تعلیمیہ کی پھیلائی ہوئی بدعات کو قبولِ عام کا درجہ دیا۔ ورنہ فی نفسہ وہ بہت کمزور اور بودی تھیں انھوں نے اس نزاع اور جھگڑے کو یہاں تک طول دیا کہ ان کی ہر ہر بات کو بلا ضرورت جھٹلایا۔ اگر انھوں نے کہا کہ دُنیا کو ایک مخصوص تعلیم اور تعین معلم کی ضرورت ہے تو انھوں نے کہا ہرگز نہیں۔ پھر جب انھوں نے کہا کہ روحانی امور کی تلقین کے لئے معمولی درجہ کا معلم کافی نہیں۔ بلکہ ایسا معلم درکار ہے جو معصوم ہو تو انھوں نے حسب معمول جواب میں انکار کیا۔ اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کو تعلیم و معلم کا فلسفہ قوی نظر آیا اور جواب غیر شافی۔ مزید برآں اس سے

لوگوں کے دلوں میں یہ غلط خیال بیٹھ گیا کہ تعلیمیہ کا مسلک قوی ہے اور انکے مخالفین کا کمزور ہے۔ یہ خود یہ نہ جان پائے کہ ایسا کیوں ہوا یہ سوئے ظن محض اس بنا پر دلوں میں ابھرا کہ حق کی حمایت جس انداز پر کی گئی وہ نامناسب تھا۔ صحیح طریق یہ تھا۔ کہ یہ بات ان لوگوں کی بغیر کسی جھگڑے کے مان لی جاتی کہ دنیا کو بلاشبہ ایک معصوم تعلیم اور ایک پاکیزہ معلم کی حاجت ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ کہا جاتا، کہ ہم جس معلم معصوم کو مانتے ہیں وہ آنحضرت کی ذات گرامی ہے۔ اس پر اگر وہ کہیں، کہ حضور کا تو انتقال ہو چکا۔ ہم کہینگے کہ آپ کا امام بھی تو نظروں سے اوجھل ہے۔ اگر وہ کہیں کہ ہمارے معلم نے تو بہت سے دعاۃ کو تعلیم دے کر اطراف واکناف عالم میں پھیلا دیا ہے اور کہہ دیا ہے کہ اگر تمہیں کوئی اشکال پیش آئے تو آکر مجھ سے دریافت کر لو، میں تمہارا منتظر ہوں۔ ہم کہینگے کہ ہمارے معلم برحق نے بھی اللہ کی طرف بلانے والوں کی ایک جماعت تیار کی ہے اور دین کو مکمل کر دیا ہے جس کے ثبوت میں یہ آیت ہے:-

الیوم اکملت لکم دینکم ۔ یعنی میں نے آج تمہارے دین کی تکمیل کر دی ۔

لہٰذا اگر تکمیل دعوت کے بعد معلم کا انتقال ہو گیا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں جس طرح کہ امام معصوم کی غیر حاضری آپ کے حق میں مضرت رساں نہیں۔ رہا یہ اعتراض کہ جن باتوں میں کوئی نص منقول نہیں انکے بارے میں تم فیصلہ کیونکر کرتے ہو۔ ظاہر ہے یہ فیصلہ نص کے مطابق تو ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ نص تو موجود ہی نہیں۔ اور اگر قیاس و رائے سے ہوگا تو ہمیشہ خطا و لغزش کا امکان رہیگا۔ ہم کہینگے کہ ہم اس صورت میں وہی کرینگے۔ جو حضرت معاذ نے اس وقت کیا جب ان کو دعوت کے لئے یمن بھیجا گیا۔ کہ اگر نص میسر آگئی تو فیصلہ کی بنیاد اس پر رکھی۔ ورنہ اجتہاد و رائے پر اکتفا کیا ۔ یہی صورت تمہارے دعاۃ کو بھی پیش آتی ہے جب وہ امام معصوم سے جدا ہو کر دور دراز ملکوں میں جاتے ہیں کہ نص و اجتہاد میں سے کونسی راہ اختیار کریں۔ کیونکہ امام کی ہدایات و نصوص تو بہر حال محدود ہونگی، اور وقائع و حالات میں ایسی رنگارنگی اور تعدد ہے کہ کوئی مجموعہ احکام بھی ان کو بیان کرنے کیلئے کافی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے لامحالہ اجتہاد و قیاس ہی کی طرف رجوع ہونا پڑیگا۔ سبب ظاہر ہے کہ یہ تو ہونے سے رہا، کہ ایک ایک مسئلہ کیلئے مبلغ امام کے شہر میں حاضری دے اور بالمشافہ ان سے ہدایات حاصل کرے۔ علاوہ ازیں اس میں یہ خطرہ بھی ہے کہ ہو سکتا ہے جب تک وہ امام کے ہاں آکر مسئلہ دریافت کرے۔ اس وقت تک مستفتی کا انتقال ہو چکا ہو۔ اور مسئلہ اپنی افادیت ہی کھو دے۔ پھر یہ صورت بھی تو ممکن ہے، کہ ایک شخص جنگل میں ہو اور نماز کا وقت آپہنچے اسوقت وہ سمت قبلہ کی تعیین بجز قیاس و رائے کے کیونکر کر پائیگا۔ اسلئے اگر امام کے پاس خود حاضر ہوتا ہے، تو کئی نمازیں فوت ہو جاتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا، کہ عند الضرورۃ قیاس و رائے پر عمل کرنا ہی قرین صواب ہے۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے۔ کہ جو اجتہاد میں خطا کرے اس کے لئے ایک نیکی ہے۔ اور جو مصیب ہو۔ اس کو دو دو نیکیاں ملینگی۔ ایک مطلق اجتہاد کی اور ایک اس کے ساتھ ساتھ صحت و حقیقت کو پا لینے کی۔ یہی حال تمام اجتہادیات کا ہے۔ کہ ان میں مظنہ صحت کا خیال رکھا جاتا ہے، مطلقاً صحت کا نہیں۔ مثلاً ایک شخص نے کسی کو فقیر سمجھ کر مال دیا حالانکہ وہ فقیر و مفلس نہیں ہے۔ تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں کیونکہ اس نے تو اپنی رائے اور اجتہاد کے مطابق اس کو مستحق خیال کر کے ہی خیرات دی ہے۔

اس پر اگر یہ کہا جائے، کہ اچھا یہ بتائیے کہ اگر اس کے مخالف کا ظن یا اجتہاد اس کے مخالف ہو۔ تو کس ظن و اجتہاد کی پیروی

کریگا۔ہم کہیں گے کہ ایسی صورت میں اس کو اپنے ہی ظن کی پیروی کرنا چاہیئے۔جیسا کہ تعیین قبلہ میں اگر اختلاف رائے نمودار ہو تو یہ اپنے ہی ظن پر عمل درآمد کریگا۔اگرچہ اس کے مخالف کی رائے دوسری ہو۔

اس توجیہ پر ان کا یہ اعتراض ہے، کہ مقلد کیوں اسکی پیروی نہیں کرتے، ان کا یہ حال ہے کہ کبھی ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی بات مانتے ہیں کبھی شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی، یا ان کے سوا دوسرے ائمہ فقہ کی، حالانکہ ان کو صرف اپنے قیاس اور گمان پر عمل کرنا چاہیئے۔

ہمارا جواب یہ ہے کہ مقلدین کا دتیرہ بھی اس باب میں اس اختلاف رائے سے مختلف نہیں۔جو تعیین قبلہ کے بارہ میں دو آدمیوں کے درمیان پیدا ہو۔ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ جس کو صحیح قبلہ کی تعیین کرنا ہے وہ اپنی ہی رائے پر عمل کریگا۔کیونکہ وہ یہی تو دیکھیگا، کہ ان میں کون شخص زیادہ جاننے والا اور زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔اسلئے اس کی پیروی بھی گویا اپنے گمان وظن ہی کی پیروی ہوگی۔بالکل یہی صورت حال مذاہب فقہیہ میں بھی ممکن ہے۔

جب انبیاء سے سہو ہوسکتا ہے انبیاء اور ائمہ نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ انسان سے رائے و اجتہاد کے معاملہ میں غلطی ہوسکتی ہے۔ **تو ائمہ معصومین سے کیوں نہیں ؟** بہرحال اجتہاد پر جو آمادہ کیا ہے، تو اس بنا پر کہ شرعی و دینی ضرورت کا یہ تقاضا ہے، اور تو اور آنحضرتؐ نے اپنے متعلق بھی یہ ارشاد فرمایا:۔ انا احکم بالظاھر واللہ یتولی السرائر۔یعنی میں تو ظاہری قرائن کی بنا پر فیصلہ کرتا ہوں، دل کے اسرار کو اللہ ہی خوب جانتا ہے۔جس کا مطلب یہ ہے کہ میرے فیصلہ کی بنیاد گواہوں کی شہادت پر مبنی ہے اور یہ عین ممکن ہے کہ گواہ جھوٹ بول رہے ہوں۔یعنی اجتہاد و فیصلہ میں مجھ سے بھی بتقاضۂ بشری غلطی ہوسکتی ہے۔غور فرمائیے کہ جب مجتہدات میں انبیاء کا یہ حال ہے تو دوسروں سے یہ توقع کب ہوسکتی ہے کہ وہ درجۂ عصمت پر فائز ہوں۔

استدلال کے اس مرحلہ پر تعلیمیہ عموماً دو سوال پیش کرتے ہیں:۔

اول یہ کہ اجتہاد کی جو تدبیر آپ نے بتائی ہے، وہ اُمورِ اجتہادیہ کی حد تک تو بے شک صحیح ہے لیکن عقائد میں کیا کیجئے گا۔ان میں تو مخطی کو معذور نہیں خیال کیا جاتا۔

ہمارا جواب یہ ہے کہ جہاں تک دین کے اصول و قواعد کا تعلق ہے وہ سب کتاب و سنت میں مذکور ہیں۔رہے امور متنازعہ فیہ تو ان کو بھی استنباط و استدلال کی ترازو سے تولا جاسکتا ہے، اس صحیح ترازو کے ممیزات کیا ہیں، اور کیونکر یقین کیا جاسکتا ہے، کہ یہ ترازو لائق اعتماد ہے۔اس کو ہم نے اپنی کتاب "القسطاس المستقیم" میں وضاحت سے بیان کیا ہے۔یہ پانچ قاعدے ہیں جن کو ملحوظ رکھنے سے عقائد کی ہر ہر گتھی کو سلجھانا ممکن ہے۔

اس پر ممکن ہے کوئی یہ کہہ بیٹھے، کہ جناب اگر مخالفین آپ کی اس ترازو یا کسوٹی ہی کو نہ مانیں تو

ہمارا جواب اس ایراد پر یہ ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔بشرطیکہ ان قاعدوں پر غور کرلیا جائے۔اہلِ تعلیم تو اس پر یوں معترض نہیں ہوسکتے کہ ہم نے ان کو براہ راست قرآن سے مستنبط کیا ہے۔منطقی اس لئے اعتراض نہیں کرسکتے کہ یہ شرائطِ منطق کے عین موافق ہیں علی ہذا القیاس متکلمین کے لئے بھی اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔کیونکہ یہ قواعد انھیں دلائل سے تعبیر ہیں۔جن کو وہ کلامیات میں عموماً

استعمال کرتے ہیں۔ اس مرحلہ پر معترض کہہ سکتا ہے، کہ جب آپ نے حق و ضلالت میں امتیاز پیدا کرنے کیلئے ایک کسوٹی دریافت کر لی ہے اور ایک ترازو معلوم کر لی ہے، تو پھر اللہ کی مخلوق میں جو پریشان کن اختلاف موجود ہے اسکو اُٹھا کیوں نہیں دیتے۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ یقیناً رفعِ اختلاف ممکن ہے، مگر یہ لوگ ہماری باتوں کو توجہ سے سنیں تو۔ ہم نے الصراط المستقیم میں ان طریقوں سے تفصیلی بحث کی ہے، جن سے اختلاف و نشتت کے دائروں کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ ان پر غور کیجیے آپ پر یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائیگی، کہ حق کیا ہے اور باطل کے حدود کیا ہیں؟ مصیبت یہی ہے کہ لوگ ہماری باتوں پر کان نہیں دھرتے، اور ان بحثوں سے دلچسپی کا اظہار نہیں کرتے۔ ایک گروہ نے البتہ ہماری باتوں کو توجہ تام سے سُنا، جس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ ان میں باہمی اختلاف نہ رہا۔

آپ کے امام کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ اپنی روحانی قوتوں سے لوگوں کو کلمۂ حق پر جمع کر سکتے ہیں۔ اگرچہ وہ انکی بات سننے پر قطعاً تیار نہ ہوں۔ اگر اس دعویٰ میں ذرا بھی صداقت موجود ہے، تو یہ کیا قصہ ہے کہ لوگوں میں اب تک اختلافات پائے جاتے ہیں آپ کے امام کی تو کیا بساط ہے، خود حضرت علیؓ جو امام الائمہ ہیں رفع اختلاف پر قدرت نہ پا سکے۔ پھر آپ کے اپنے اماموں کے بارے میں یہ عقیدہ کہ وہ جبر و قہر سے لوگوں کو سننے اور منوا لینے پر مجبور کر سکتے ہیں کہاں تک لائق قبول ہے۔ آج تک تو یہ ہوا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس میں توقف کیا ہے، اور رفعِ اختلاف کا یہ معاملہ کب تک اٹھا رکھا جائیگا۔ بلکہ ہم تو یہ کہیں گے، کہ آپ کے مزعومہ امام کی کوششوں سے اختلاف رفع تو کیا ہوتا البتہ اور بڑھ گیا ہے۔ اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے۔ کہ خدانخواستہ یہ اختلاف قتل و غارت کی صورت اختیار نہ کرے اسلامی مُلک تباہ نہ ہو جائیں۔ اور لوگوں کو شدید بدامنی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

افکارِ غزالی

(مصنفہ مولانا محمد حنیف ندوی)

اس کتاب میں یہ کوشش کی گئی ہے۔ کہ "احیاء العلوم" کی مختصر مگر مستند تلخیص پیش کی جائے۔ جس میں غزالی کے تمام علمی و اصلاحی افکار کی جھلک موجود ہو۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ علم اور اس کے حدود کیا ہیں؟ علماء حق یا طالبانِ آخرت اور علماءِ سو، یا شیفتگانِ رذائل دنیا میں کیا فرق ہے؟ زندگی کے فقہی انداز میں کیا قباحتیں ہیں؟ مناظرہ و جدل کیوں ناجائز ہے؟ ریاء کیا ہے؟ اخلاص کس سے تعبیر ہے؟ اصلاحِ باطن کیوں ضروری ہے؟ ظاہر و معنی میں کیا ربط ہے؟ اور کہاں کہاں؟ ہم مجبور ہیں کہ الفاظ و ظواہر کے اقتضاء کو چھوڑ کر مغز و معنی اور روح و اصل کی طرف رجوع کریں۔ اس ڈھنگ کی بیسیوں عارفانہ بحثیں ہیں جو اس کتاب کی وسعتوں میں سمٹ آئی ہیں۔ قیمت پانچ روپے۔

ملنے کا پتہ

سکریٹری، ادارۂ ثقافت اسلامیہ۔ ۲۔ کلب روڈ۔ لاہور۔ پاکستان۔